22

# رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کی قربانیوں اور ذمہ داریوں کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے

(فرمودہ 22 جولائی 1949ء بمقام پارک ہاؤس کوئٹہ)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیت قرآنیہ کی تلاوت کی: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ 1

اس کے بعد فرمایا:

''دنیا میں ہر نبی کے آنے پر اُس کو اور اُس کی جماعت کو مختلف قسم کی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن دوسرے نبیوں کی قربانیوں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانیوں میں یہ فرق ہے کہ دوسرے نبیوں کی قربانیاں کسی نہ کسی جگہ پر جا کر ختم ہو گئیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کی قربانیاں قیامت تک ختم نہیں ہوں گی۔ دنیا میں اگر کسی کو ملیریا بخار آتا ہے تو اس کو یہ تسلی ہوتی ہے کہ دو چار دن میں یہ بُخار اُتر جائے گا۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس تکلیف کے لیے ایک وقت مقرر ہے اُس وقت پر جا کر یہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ یا ٹائیفائڈ ہے یہ بیشک ایک سخت مرض ہے اور لمبے عرصہ تک چلا جاتا ہے لیکن بہرحال کسی نہ کسی وقت پر جا کر یہ بیماری ختم

ہو جاتی ہے اور مریض سمجھتا ہے کہ اسے یہ بوجھ چودہ یا اکیس دن تک اُٹھانا پڑے گا۔لیکن ایک بیماری ایسی ہوتی ہے جو ہمیشہ ہمیش تک چلی جاتی ہے۔ گویا کہ وہ تمام عمر کا روگ ہوتا ہے۔ مثلاً سِل، دِق اور دمہ کی بیماریاں ہیں ان کے متعلق انسان کو یہ اُمید نہیں ہوتی کہ یہ جلدی ختم ہو جائیں گی۔ بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ ایک لمبے عرصہ تک مجھے یہ بیماریاں برداشت کرنا پڑیں گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کا بوجھ بھی ایسا ہی ہے جو قیامت تک کے لیے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے حضرت موسٰی علیہ السلام کے کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس کی تعلیم ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی ہو۔ زیادہ سے زیادہ عرصہ حضرت موسٰی علیہ السلام کی تعلیم کا ہے جو دو ہزار سال کے قریب رہی۔لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کا بوجھ صرف دو ہزار سال کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔بعض لوگوں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے قیامت کو بہت نزدیک کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بعض احادیث کے غلط معنے کر کے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ کسی طرح یہ بوجھ ٹل جائے۔ مثلاً وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ 2 کے یہ معنے کرتے ہیں کہ میں اور قیامت دو انگلیوں کی طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ یعنی جس طرح انگشتِ شہادت اور وُسطٰی دونوں انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں اِسی طرح میں اور قیامت آپس میں ملے ہوئے ہیں۔لیکن اگر قیامت آپ کے ساتھ اسی طرح ملی ہوئی تھی تو آپ کی وفات کے فوراً بعد نہ سہی دس بیس سال کے بعد تو آ جانی چاہیے تھی، پچاس سال کے بعد آ جانی چاہیے تھی، سَو سال کے بعد آ جانی چاہیے تھی، دوسَو یا تین سَو سال کے بعد آ جانی چاہیے تھی۔ مگر تیرہ سو سال سے اوپر عرصہ گزر گیا اور ابھی تک قیامت نہیں آئی۔ دراصل اس حدیث کا یہ مطلب تھا کہ میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نئی شریعت والا نبی نہیں آئے گا۔ میرا زمانہ اور قیامت آپس میں ملتے ہیں اور خواہ قیامت دو کروڑ سال کے بعد ہی کیوں نہ آئے میرے اور اس کے درمیان کوئی اَور شریعت نہیں آئے گی۔ چنانچہ وہ بات تو غلط نکلی۔ تمام مسلمان سمجھتے تھے اور یہ بات سچی نکلی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تیرہ سَو سال کے بعد اگر کوئی نبی آیا بھی تو اس نے آ کر یہی بات کہی کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جُدا نہیں ہوں۔ میں آپ کے ہی خادموں میں سے ایک خادم ہوں اور آپ کے دین کی اشاعت کے لیے

آیا ہوں۔ مجھے نبوت کا انعام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپ کی غلامی میں ہی ملا ہے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا کہ میں اور قیامت ان دو اُنگلیوں یعنی انگشتِ شہادت اور وُسطیٰ کی طرح آپس میں ملے ہوئے ہیں اس کے محض اتنے ہی معنے تھے کہ میرے اور قیامت کے درمیان کوئی اَور نبی نہیں آئے گا۔ اور اگر آئے گا تو ایک رنگ میں وہ میں ہی ہوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اور قیامت آپس میں دو اُنگلیوں کی طرح اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ میں فوت ہوا تو قیامت واقع ہو جائے گی۔ اگر اس کے یہی معنی تھے تو آپ کی وفات کے بعد قیامت آ جانی چاہیے تھی۔ مگر تیرہ سَو سال کا عرصہ گزر گیا اور ابھی تک قیامت نہیں آئی بلکہ آپ کے دعویٰ کو لیا جائے تو اس پر قریباً چودہ سَو سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ پھر ابھی مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق مسیح اور مہدی نے بھی آنا ہے۔ لیکن قیامت کے جو آثار اور علامات بیان کی جاتی ہیں وہ ابھی موجود نہیں۔

قیامت دو ہی طرح آ سکتی ہے۔ اوّل اس طرح کہ دنیا کی مادی حیثیت ایسی ہو جائے کہ اس میں انسان رہ نہ سکے مگر یہ تغیر ابھی تک نظر نہیں آتا۔ دوم اس طرح کہ اس کی اقتصادی حالت ایسی ہو جائے کہ اس میں کوئی آدمی نہ رَہ سکے اور یہ تغیر بھی ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

ایٹم بم کے متعلق جو عام طور پر تصور پایا جاتا ہے وہ بھی درست نہیں۔ ایٹم بم سے چند بڑے بڑے شہروں کو ہی تباہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ ایک ایک ایٹم بم پر دو تین کروڑ روپیہ خرچ آتا ہے اور اتنا روپیہ خرچ کرنے کے بعد وہ کونسی حکومت ہوگی جو اسے چھوٹے چھوٹے قصبات اور گاؤں پر پھینکنا شروع کر دے۔ یہ تو چند بڑے بڑے شہروں کو تباہ کرنے کے لیے ہی استعمال کیا جا سکتا ہے جن کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ اگر وہ شہر برباد ہو گئے تو قوم کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی یا اس قدر اقتصادی نقصان پہنچ جائے گا کہ وہ پھر اُٹھ نہ سکے گی۔ ورنہ چھوٹے چھوٹے قصبات اور گاؤں ایٹم بم سے اسی طرح محفوظ ہیں جیسے ہوائی جہازوں سے پھینکے جانے والے دوسرے بموں سے۔ اگر کوئی حکومت چھوٹے چھوٹے قصبات پر ایٹم بم پھینکنا شروع کر دے تو اس کا دیوالہ نکل جائے۔ غرض ابھی تک کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو دنیا کے خاتمہ پر دلالت کرتی ہو۔ پھر اقتصادی لحاظ سے بھی یہ دنیا ابھی ہزاروں سال تک باقی رہ سکتی ہے۔ آجکل سب سے زیادہ اہم سوال خوراک کا ہے

اور یہ کہا جاتا ہے کہ خوراک کی وجہ سے اس دنیا کا زیادہ دیر تک چلنا مشکل ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ کے بعد غلہ کی قیمت گرنی شروع ہو جاتی ہے۔ پچھلی جنگ کے بعد لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ دنیا اب باقی نہیں رہ سکتی اب قیامت آ جائے گی اور یہ دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی لیکن 1928ء اور 1929ء میں غلہ کی قیمت گر کر سَوا روپیہ فی مَن پر آ گئی تھی اور قیمت کم اُس وقت ہوتی ہے جب اُس کے خریدار کم ہوں۔ 1928ء، 1929ء میں غلہ کی قیمت اتنی کم ہوگئی تھی کہ زمینداروں کے لیے حکومت کو مالیہ ادا کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں ایک سِکھ رئیس میرے پاس آیا۔ وہ کانگرس سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اس کے پاس بیس پچیس مربع زمین تھی۔ اس نے کہا کانگرس سے ہمدردی رکھنے کی وجہ سے حکومت مجھ سے دشمنی کرتی ہے آپ میری سفارش کر دیں۔ میں گندم کا ایک دانہ بھی نہیں اُٹھاتا سب گندم حکومت اُٹھائے لیکن مجھ سے مالیہ کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس وقت گندم کی قیمت کس حد تک گر گئی تھی اور یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب کھانے والے کم ہوں۔

گزشتہ سالوں میں جو قحط پڑے ہیں وہ عارضی حالات کا نتیجہ تھے۔ آبادی کا بہت سا حصہ ایسا تھا جو لڑائی کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں بھاگ کر چلا گیا تھا اور اس طرح اس علاقہ میں پوری طرح کاشت نہ ہوسکی۔ یا لوگوں کے مکانات گر گئے تھے اور وہ جلد اپنے علاقوں میں دوبارہ نہ بس سکے جس کی وجہ سے پوری طرح کاشت نہ ہوسکی۔ اَور بھی کئی قسم کی تباہیاں آئیں مثلاً بیج نہیں مل سکتے تھے جس کی وجہ سے قحط کے آثار پیدا ہو گئے لیکن اب لوگ اپنی اپنی جگہ واپس چلے گئے ہیں اور کاشت میں جو روکیں تھیں وہ دُور ہو چکی ہیں۔ اس سے اب غلہ بڑھ رہا ہے لیکن قطع نظر اِس سے کہ موجودہ زمین کی آمد دنیا کو پالنے کے لیے کافی ہے۔

قرآن کریم سے ہمیں معلوم ہوتا ہے اگر صحیح طور پر زمین کی طاقتوں کو استعمال کیا جائے تو چار پانچ سَومَن فی ایکڑ پیداوار ہوسکتی ہے۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن مجھے ایک ماہر سائنسدان نے بتایا ہے کہ زمین کے نمک جن سے غلہ پیدا ہوتا ہے پوری طرح استعمال کیے جائیں تو گندم کی آمد دو سَو من فی ایکڑ تک ہوسکتی ہے اور جب دو سَو من فی ایکڑ آمد ہوسکتی ہے تو چار پانچ سَو مَن فی ایکڑ بھی ناممکن نہیں۔ اِس وقت اوسط آمد آٹھ دس مَن فی ایکڑ سے بھی کم ہے لیکن اس مقدار

تک گندم کی آمد کو پہنچایا جائے جو قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے تو موجودہ دنیا اگر 48 گُنا اَور بڑھ جائے تب بھی اس کا گزارہ ہوسکتا ہے اور اس کے لیے کئی ہزار سال کا عرصہ درکار ہے۔ غرض خوراک کے لحاظ سے بھی دنیا موجودہ دَور میں ہزاروں سال تک چل سکتی ہے۔ پس اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ والی حدیث کے معنے قُربِ قیامت کے کرنے درست نہیں۔ باقی رہا خدا تعالیٰ کا فعل سو وہ اگر مارنا چاہتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسا کرسکتا تھا بلکہ اگر وہ اس دنیا کو پیدا ہی نہ کرتا تو کیا تھا؟ پس خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی قربانیوں اور ذمہ داریوں کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے اور ان کا کوئی دوسرا نبی اور اس کی قوم مقابلہ نہیں کرسکتی۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی قربانیاں اور ذمہ داریاں نہ صرف سب سے زیادہ ہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے آپ کی اور آپ کی امت کی قربانیوں اور ذمہ داریوں کی نوعیت کو بھی بدل دیا ہے۔ گویا نہ صرف زمانہ کو نامعلوم حد تک لمبا کر دیا گیا ہے بلکہ قربانیوں کی نوعیت کو بھی بدل دیا ہے۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے جس کی میں نے ابھی تلاوت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے رسول! تُو لوگوں سے کہہ دے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب خدا تعالیٰ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا رب ہے۔ اس آیت میں گو مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن دوسرے لوگ بھی مخاطب ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوسکتے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے اے میرے رسول! تُو ان لوگوں سے کہہ دے کہ تمہاری نجات اسی بات میں ہے کہ تم میرے کامل متبع بنو۔ ایک مشہور آیت یہ ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[3] یعنی اے میرے رسول! تُو ان سے کہہ دے کہ اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو تم میرے پیچھے چلو اور میرے اعمال کی نقل کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگ جائے گا۔ پس قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی آیت جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے ویسے ہی دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے کیونکہ انہیں آپ کی مکمل اتباع کا حکم ہے۔

صلوٰۃ کے معنے نماز کے ہیں اور نماز ایسی چیز ہے جس کا تعلق جسم، دماغ اور دل کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس ''صلوٰۃ'' اُس قربانی کو کہتے ہیں جو جسم اور دل و دماغ سے تعلق رکھتی ہو۔ اور ''نَسِیْکَۃ'' جسم سے باہر کی قُربانی کو کہتے ہیں جو انسان اپنے اموال کی صورت میں پیش کرتا ہو۔ ''صلوٰۃ'' میں دل و دماغ اور جسم کے ساتھ تعلق رکھنے والی قربانی کو مدنظر رکھا گیا ہے اور ''نَسِیْکَۃ'' میں اموال کی قربانیوں کو مدنظر رکھا گیا ہے خواہ وہ کسی مقصد کے ماتحت ہوں یا بلا مقصد کی گئی ہوں۔ ''نَسِیْکَۃ'' میں یہ عجیب بات ہے کہ بعض قربانیاں ایک خاص مقصد کے ماتحت کی جاتی ہیں اور بعض بلا مقصد کی جاتی ہیں۔ مثلاً حج پر لوگ جاتے ہیں اور وہاں قربانیاں کرتے ہیں۔ حج پر جانے والوں کی تعداد تین تین، چار چار لاکھ تک جا پہنچتی ہے اور ہر ایک شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ قربانی کرے۔ اگر اس موقع پر ایک لاکھ بکرے کی قربانی بھی کی جائے تو وہ لوگ انہیں کھا نہیں سکتے۔ ایک ایک بکرے کو کھانے کے لیے پچاس پچاس آدمی چاہییں۔ اس طرح ایک لاکھ بکروں سے حاجیوں کے لیے پانچ ہزار بکرا کافی ہوسکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ ہزار بکرے ان کے اپنے استعمال میں آجائیں گے باقی سب گوشت ضائع چلا جاتا ہے۔ اسی لیے وہاں ایک کھیل سی کھیلی جاتی ہے اور وہ یہ کہ بکرا ذبح کرنے کے فوراً بعد لوگ اُسے اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہاں بکرے کی کوئی قیمت نہیں۔

میں جب حج پر گیا تو مَیں نے خیال کیا کہ حج کا موقع بار بار کہاں ملتا ہے اس لیے میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خلیفۃ المسیح الاول اور دیگر عزیزوں اور جماعت کی طرف سے سات آٹھ قربانیاں دیں۔ جب ہم بکرے ذبح کرواتے تھے تو ذبح کرنے والوں کی چُھری ابھی ذبیحہ کے جسم سے باہر نہیں نکلتی تھی کہ عرب آتے، بکرے کو ٹانگوں سے پکڑتے اور گھسیٹ کر لے جاتے، اور یہ چیز صرف ہمارے ہی ساتھ نہیں تھی دوسرے سب لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ہر طرف قہقہے لگ رہے تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بکروں اور دُنبوں کو پوچھتا ہی کون ہے۔ قصاب نے کہا آپ ایک بکرے کی چھاتی پر بیٹھ جائیے تا کہ آپ کے کھانے کے لیے ایک آدھ بکرا بچ جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ہمیں بھی تو گوشت کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے وہاں کونسے واقف اور عزیز تھے جنہیں ہم نے گوشت دینا تھا۔

ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ بکروں کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں تو لے جانے دو ہماری طرف سے تو قربانی ہوگئی۔ اِسی وجہ سے بعض مخالفین اعتراض کرتے ہیں کہ حج کے موقع پر جب وہاں لاکھوں کی تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں تو جو قربانیاں کی جاتی ہیں اُن کا کیا فائدہ؟ ویسے تو حج پر غرباء بھی جاتے ہیں لیکن حج کے لیے حکم تو یہی ہے کہ صاحبِ استطاعت لوگ جائیں اور ہر ایک شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ قربانی کرے لیکن اتنا گوشت کھائے گا کون؟ پھر وہاں صرف بکروں اور دُنبوں کی ہی قربانی نہیں دی جاتی بلکہ بعض لوگ اونٹ بھی ذبح کرتے ہیں۔ حج کے موقع پر گائے کی قربانی بہت کم ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ایک دفعہ اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی تھی لیکن اس کا رواج بہت کم ہے۔ اونٹ کی قربانی لوگ عام کرتے ہیں اور اونٹ کا گوشت سینکڑوں آدمیوں کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ آریوں کی طرف سے بھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حج کے موقع پر گوشت ضائع کیا جاتا ہے اور ایسے موقع پر کیا جاتا ہے جب لاکھوں کی تعداد میں وہاں مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے یہ کام ہوتا ہے۔ اب بظاہر یہ بات بے فائدہ اور بے مقصد معلوم ہوتی ہے لیکن اسلام نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔

درحقیقت دنیا میں ہزاروں کام ایسے ہوتے ہیں جو قوم کو اس لیے کرنے پڑتے ہیں کہ ان کا لیڈر کہتا ہے کہ تم ایسا کرو۔ وہ موقع ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی پوچھے تم نے مجھے یہ حکم کیوں دیا اور میں ایسا کیوں کروں؟ کیونکہ زندہ قومیں جانتی ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ کر قربانیاں کرنا ہی اصل چیز ہے اور یہ ان کے زندہ ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمِ اطہر ہمیشہ کے لیے مبارک تھا اُس کے لیے کوئی خاص وقت برکت کا نہ تھا۔ جس وقت سے خدا تعالیٰ نے آپ کو نبی قرار دیا تھا اُسی وقت سے آپ کا جسم مبارک تھا۔ پھر صحابہؓ کے سامنے آپؐ ایک دفعہ نہیں آئے کم ازکم پانچوں وقت نماز کے لیے آپ باہر تشریف لاتے تھے اور آپ کو نماز کے لیے وضو کرنا پڑتا تھا لیکن صحابہؓ یہ نہیں کرتے تھے کہ آپ کے وضو کا پانی اُٹھا اُٹھا کر لے جائیں۔ لیکن صلح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ وضو کرنے لگے تو صحابہؓ آئے اور پانی کا ایک ایک قطرہ جو گِرا انہوں نے اٹھا کر اپنے منہ اور دوسرے اعضاء پر لیا۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ شاید ہی کوئی قطرہ نیچے گرا ہو۔ صحابہؓ پانی لینے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح لڑتے تھے کہ

گویا وہ ایک دوسرے کو مار ڈالیں گے۔4 ہم یہ مانتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں اوران کے مستعمل پانی میں بھی برکت تھی۔ لیکن ہم یہ نہیں مانتے کہ برکت اُس دن ہی تھی پہلے نہیں تھی۔ اُس دن اگر صحابہؓ نے ایسا کیا تو دنیا کو دکھانے کے لیے کیا تھا۔ آپؐ کے شدید ترین دشمن آئے ہوئے تھے اور اُن میں سے ایک نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تم آوارہ گرد لوگوں پر اعتبار کرتے ہو۔ لوگ وقت پر تمہارے کام نہیں آئیں گے۔ وقت پر کام آنے والے وہی لوگ ہوں گے جن کا آپ سے خونی رشتہ ہے۔ اس لیے صحابہؓ اُس وقت یہ دکھانا چاہتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قربانی کرنا تو الگ رہا ہمیں آپؐ سے اتنی محبت ہے کہ تم اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو آپؐ کے مستعمل پانی کو بھی نیچے گرنے دینا پسند نہیں کرتے۔ تو دیکھو وہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، وہی صحابہؓ تھے اور وہی پانی تھا جو روزانہ پانچ وقت کم سے کم وضو کرتے ہوئے صحابہؓ کے سامنے نیچے گرتا تھا لیکن حدیبیہ کے موقع پر صحابہؓ نے اپنی محبت کا یہ نمونہ دکھایا کہ پانی نیچے نہیں گرنے دیا اور ثابت کر دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو انہیں محبت ہے وہ دُشمن کے واہمہ میں بھی نہیں آسکتی۔ مگر یہاں تو ایک مقصد تھا جس کو سامنے رکھ کر صحابہؓ نے کام کیا لیکن بعض دفعہ ایسی قربانی بھی کی جاتی ہے جس کا بظاہر کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور قربانی کرنے والا بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ اس کے حکم کی فرمانبرداری میں ایسا کر رہا ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ مکہ سے صلح کر لی جس کی وجہ سے صحابہؓ کے اندر اس قدر بے چینی پیدا ہوگئی کہ حضرت عمرؓ جیسا آدمی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور انہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم طوافِ کعبہ کریں گے یا کیا اسلام کے لیے غلبہ مقدر نہیں تھا؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں! حضرت عمرؓ نے کہا پھر ہم نے دَب کر صلح کیوں کر لی؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم طواف کریں گے مگر یہ نہیں تھا کہ اِسی سال کریں گے۔5 صحابہؓ پر اِس صدمہ کا اتنا اثر تھا کہ اس کی برداشت ان کے لیے ناممکن ہوگئی تھی۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ قربانیاں یہیں ذبح کر دو تو یہ بات انہیں عجیب سی

معلوم ہوئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ قربانی تو مکے میں ہونی تھی اور پھر عمرہ یا حج کے بعد ہونی تھی اور جب ہم مکہ گئے نہیں، خانہ کعبہ کا طواف کیا نہیں یا ہم نے عمرہ یا حج کیا نہیں تو پھر یہ قربانی کیسی؟ اسی لیے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانیاں یہیں ذبح کر دو تو انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ آپؐ کی عادت تھی کہ جب کسی بات پر آپؐ ناراض ہو جاتے۔ طبیعت میں جوش آجاتا تو اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے تمہارے بھائیوں یا تمہاری قوم نے ایسا کیا ہے۔ اُس وقت اپنی طرف قوم کی نسبت نہ فرماتے۔ غرض آپ اپنے گھر تشریف لے گئے اور اپنی بیوی سے فرمایا آج تیری قوم کو میں نے یہ حکم دیا تھا کہ قربانیاں یہیں ذبح کر دو مگر وہ اپنی جگہوں سے اُٹھے نہیں اور ان پر میری آواز کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! اتنی قربانیاں کرنے کے بعد یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ حکم دیں اور صحابہؓ جان بوجھ کر اس کی نافرمانی کریں۔ انہوں نے محبت کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا بلکہ صدمہ کا ان پر اس قدر اثر ہے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔ وہ یہ امیدیں لے کر آئے تھے کہ ہم دس بارہ سال کے بعد مکہ جائیں گے عمرہ یا حج کریں گے اور اپنے دلوں کو خوش کریں گے۔ انہیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اُن کے راستہ میں کوئی روک پیدا ہو جائے گی۔ آپ نے مشرکین مکہ سے صلح کر لی جس کی وجہ سے انہیں صدمہ پہنچا۔ پس آپ کے حکم پر اُن کا قربانی کرنے کے لیے تیار نہ ہونا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس صدمہ کے اثر کی وجہ سے ہے۔ آپ سیدھے جا کر اپنی قربانی ذبح کرنا شروع کر دیجیے۔6 صحابہؓ کو کچھ نہ کہیں۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بہت اچھا! آپ نے نیزہ ہاتھ میں لے لیا اور صحابہؓ کی طرف کوئی توجہ کیے بغیر سیدھے اپنی قربانی کی طرف گئے۔ آپ کا اونٹ کو نیزہ مارنا تھا کہ صحابہؓ پاگلوں کی طرح اپنی جگہوں سے اٹھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے۔ کچھ صحابہ آپ کی مدد کرنے لگ گئے اور کچھ اپنی قربانیاں ذبح کرنے لگ گئے۔ اس وقت صحابہؓ میں اِس قدر جوش پایا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تلواریں چھینتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ میں دوسرے سے پہلے قربانی ذبح کر لوں اور تھوڑی دیر میں انہوں نے سب قربانیاں ذبح کر دیں۔7 یہ قربانی بظاہر بے معنی تھی، صحابہؓ مکہ میں داخل نہیں ہوئے، انہوں نے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کیا تھا، انہوں نے عمرہ یا حج نہیں کیا تھا مگر پھر بھی ان سے

قربانیاں کروائی گئیں کیونکہ خداتعالیٰ یہ بتانا چاہتا تھا کہ کسی جگہ کو بالذات تقدیس حاصل نہیں ہوتی۔ خداتعالیٰ جس جگہ کو مقدم قرار دے دیتا ہے وہی مقدس بن جاتی ہے۔ ایک اردو شاعر نے کہا ہے۔

؎ جدھر ملے وہ قبلہ اُدھر طواف کریں

یعنی ہم تو اپنے معشوق کے دیوانے ہیں اور ہمارا قبلہ ہمارا معشوق ہے۔ جہاں وہ ملے ہم طواف کرلیں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے واقعہ میں مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ بیشک خانہ کعبہ ایک مقدس ترین مقام ہے جس کا طواف کیا جاتا ہے مگر اس کو تمہارے خدا نے ہی مقدس بنایا ہے۔ اگر لوگ تمہیں وہاں نہیں جانے دیتے، تمہیں رستہ میں ہی روک لیتے ہیں تو جہاں وہ روک دیتے ہیں وہیں قربانی کردو۔ کیونکہ وہی جگہ خداتعالیٰ کا گھر ہے۔ غرض بظاہر یہ ایک بے مصرف قربانی تھی، ایک ''نَسِیْکَة'' تھی جو صحابہؓ نے بیسیوں دفعہ بعد میں کی لیکن اپنے اندر ایسی شان رکھتی تھی کہ دوسری قربانیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

مکہ فتح ہوا اور بعض صحابہؓ نے بیس بیس، تیس تیس حج کیے اور قربانیاں بھی کیں لیکن روحانیت سے دیکھنے والی آنکھ جانتی ہے کہ وہ قربانیاں صلح حدیبیہ والی قربانی کے سامنے کچھ قیمت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ وہاں خداتعالیٰ خود اُتر آیا تھا اور خداتعالیٰ کے سامنے جو قربانی کی جائے اُس کے سامنے دوسری قربانیاں حیثیت ہی کیا رکھتی ہیں۔ وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خداتعالیٰ خود جلوہ افروز ہوا اور اس نے خود جلوہ فرما کر مشرکینِ مکہ کو بتا دیا کہ تم کہتے ہو خانہ کعبہ ہمارا ہے ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو وہاں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ سو ہم عارضی طور پر اسے تمہارا ہی سمجھ لیتے ہیں اور اپنا گھر اس جگہ کو قرار دے دیتے ہیں جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی اُترے ہوئے ہیں۔

غرض بظاہر یہ ایک بے حقیقت قربانی تھی لیکن کتنا فلسفہ ہے جو اس میں پایا جاتا ہے۔ پس: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت اگر ایک طرف جسم اور دل اور دماغ سے تعلق رکھنے والی قربانیاں پیش کرتی ہے تو دوسری طرف وہ ''نَسِیْکَة'' یعنی

اموال سے تعلق رکھنے والی قربانی جو خواہ کسی مقصد کے ماتحت ہو یا بلا مقصد ہو پیش کرتی ہے اور اس میں کوئی دوسرا نبی اور اس کی قوم آپ کا مقابلہ نہیں کرسکتی''۔

(الفضل 16 دسمبر 1959ء)

---

1 : الانعام:163

2 : بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثتُ انا والساعة کهاتین

3 : آل عمران:32

4 تا 7 : بخاری کتاب الشروط باب الشُّروُط فی الجهاد